''کہ انسان کبھی کسی کو خوفزدہ نہ کرے.....''

''ہاں لیکن بدقسمتی سے ہم دوسروں سے خوفزدہ ہوتے رہتے ہیں اور دوسروں کو خوفزدہ کرتے رہتے ہیں.....''

انکل ریمس عموماً مجھے فوک وزڈم کی کہانیاں سناتا ہے۔ وہ کچھ سوچتا گنگناتا مسکراتا ہوا بولا۔

''سنو..... جہاں سے میں آیا ہوں وہاں مجھے احساس نہیں تھا کہ میں نیگرو ہوں..... کیونکہ وہاں سب کالے تھے.....''

میں کچھ شرمندہ ہو گیا، حالانکہ میں بھی سفید فام نہ تھا۔

''ہاں کچھ ایسے ہی ہے.....''

''تم جانتے ہو..... جب آدمی احساس کمتری میں مبتلا ہو تو وہ چڑچڑا کمینہ اور ناشکرا ہو جاتا ہے''۔

''ہاں شاید تم ٹھیک کہتے ہو.....''

''معلوم ہے یہ احساس کمتری کب پیدا ہوتا ہے؟''

''میں نے کبھی سوچا نہیں انکل ریمس''

کالی کوئل ڈبل روٹی کا بھورا منہ میں ڈال کر اڑ گئی، جاتے ہوئے وہ جیسے گا لی گئی۔

کون می پینا کوئلہ

سرنیا

یونانا گولا

وائی پی ماری دیتو

سرنیا

ان پی جپا

''سوچا کرو برادر، سوچا کرو تمہارے مذہب میں تو سوچنے کا بڑا حکم ہے۔ یہ کوئل

کیوں دفنزدہ نہیں اور ہم کیوں ڈرتے رہتے ہیں۔ جب تک میں کونگو کے طاس میں تھا، مجھے کوئی احساس کمتری نہ تھا۔ جب تک مقابلہ نہ ہو..... تم سے بہتر یا کمتر موجود نہ ہو، حساس کمتری پیدا نہیں ہوتا..... جب نیگرو اپنے جیسوں میں تھا تو وہ شاکی نہیں تھا۔ غریب آدمی غریبی میں خوش رہتا ہے، جب تک اسے کسی امیر سے پالا نہیں پڑتا۔ میری پوتی ایملیا نے سکول چھوڑ دیا ہے..... وہ ملاٹو..... ہے جانتے ہو مولاٹو کون ہوتے ہیں.....؟"

"نہیں"۔

"وہ لوگ جن میں سفید لوگوں کا خون بھی ہوتا ہے۔ جھونا مکمل طور پر نہ سیاہ ہوتے ہیں نہ سفید..... میری پوتی ایملیا اب سکول نہیں جاتی۔ وہ برگر کنگ میں فش اینڈ چپس بیچتی ہے....."

"لیکن اس نے سکول کیوں چھوڑ دیا انکل ریمس"۔

انکل ریمس کے پاس باتوں کا سٹور ہاؤس ہے۔ وہ کبھی کبھی بات کرنے سے پہلے ایک لمبی تان آئی آئی آئی لگاتا ہے پھر ایک آدھ مصرع گا کر مخاطب کرتا ہے۔ کون فی پنیا کوئلہ میں نے پہلی بار اسی سے سنا تھا۔ میں اس سے اس کے معنی نہ پوچھ پایا۔

"ایملیا کہتی ہے..... سکول میں بہت سی ذہین لڑکیاں ہیں۔ گرینڈ پا وہ اتنا چمکتی ہیں کہ ان کے سامنے ایملیا چمک نہیں سکتی..... میں تو پہلے ہی اپنی جلد بلیچ کر کر کے تھک گئی ہوں۔ اب میں اور احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی"۔

"کبھی کبھی سوچتا ہوں الٰہی یہ اتنی اونچ نیچ کیوں رکھتی ہے....." میں نے شکستگی سے پوچھا۔

"اس لئے بردرکہ ارتقاء ہو، تبدیلی آئے۔ انسان اپنی کوشش سے بہتر ہوتا چلا جائے..... انسان قیامت تک پہنچ پائے۔ تمہیں پتہ ہے سب سے پہلے انسان کانگو کے طاس میں آیا۔ اس وقت ساری دنیا میں صرف کالے تھے۔ کہیں نفرت نہ تھی، سب مل جل کر

رہتے تھے اور کوئی کسی سے کمتر نہ تھا۔ سب طرف محبت تھی اور تبدیلی کی کوئی صورت نہ تھی۔ پھر ایک دن ایک سیاہ حبشی چلتا چلاتا چلتا چلاتا ایک غار میں جا پہنچا۔ وہاں جھاڑیوں میں چھپا چھوٹا سا چشمہ گیزر کی طرح چل رہا تھا۔ غار میں روشنی کم تھی، لیکن کالا انسان پیاسا تھا۔ اس نے چشمے سے منہ دھویا اور سیر ہو کر پانی پی لیا۔ جب وہ غار سے باہر نکلا تو اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی۔ دیکھتا کیا ہے کہ اس کی رنگ بالکل سفید ہو چکی تھی۔ اب وہ کالے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ ایک اور نسل پیدا ہو گئی تھی''۔

یکدم وہ گانے لگا.....

''آئی سنورا اینڈ وائی؟

میں ہوانا میں پیدا ہوتا ہوا

اسے ڈومنگو کہتے تھے

میں کالا سیاہ تھا

اور بد قسمت بھی تھا

کیونکہ میرے والدین نہیں تھے.....

جو مجھے سیاہ ہونے کا مطلب سمجھاتے!

تھوڑی دیر ٹرالالا کرتا وہ گاتا رہا پھر خود ہی کہانی کی طرف لوٹ آیا۔

''سنو بر در سفید آدمی کو اس کے گھر والوں نے جب دیکھا تو اسے پہچاننے سے انکار کر دیا، اب آہستہ آہستہ سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ یاکو کے چشمے کا پانی جسم پر ملنے سے انسان سفید ہو جاتا ہے..... ہولے ہولے لوگ کھسکنے لگے..... اور اپنا رنگ تبدیل کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اللہ کئی طریقوں سے تبدیلی لایا کرتا ہے بڑی..... جونہی کسی کا رنگ بدل جاتا، وہ گاؤں سے کھسک جاتا، کیونکہ اسے کالوں سے خود بخود نفرت پیدا ہو جاتی.....''

آئی آئی آئی

یا کایا کا.....یا کایا کا

سفید فام لوگوں نے جنگلوں کے اندر کہیں اپنی بستی بسالی اور بوکیف بم.....بوکیٹ ٹم

ایک نیا Ethnic گروپ وجود میں آیا۔ یہاں سے Races پیدا ہوئیں، لیکن پھر چشمہ سوکھ گیا۔ گاڈ لارڈ کی مرضی.....وہ عجیب طریقوں سے تبدیلی لاتا ہے۔ انسان کو پتہ نہیں چلتا، لیکن ہر موڑ پر تبدیلی ہے، لیکن ہماری مرضی سے نہیں گاڈ لارڈ کی مرضی سے.....ہم سمجھ نہیں سکتے۔

میں بھی انکل ریمس کو ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ وہ ہنستا ہے تو چھاتی سے آرگن کے سر نکلتے ہیں۔

''سنو ایشیائی انڈر ڈوگ..... اللہ اور عورت کو سمجھنے کی کوشش کبھی نہ کرنا، مار کھا جاؤ گے۔ یہ دونوں سمجھنے کی چیزیں نہیں ہیں.....ان دونوں کا تعلق Superstition سے ہے۔ اگر تم انہیں مان لو تو فائدہ دیں گے نہ مانو.....تو تمہیں توڑ پھوڑ دیں گے۔ یہ شگون ہیں.....فال ہیں۔ مزدہ ہیں ان کے بغیر مرد کبھی راستے تلاش نہیں کر سکتا!

یہ دادی کے مرنے سے پہلے کی بات ہے۔ دادی ٹمپل روڈ والے گھر میں ہم سے بچھڑی۔ اس کے سارے بال سفید، دانت پان زدہ کیسری رنگ ہوئے جسم مڑا تڑا، آواز میں خرخر اور چال میں اب گری کہ اب گری والی کیفیت تھی، لیکن ذہنی طور پر دادی چوکس تھی، اسے ہر وقت علم رہتا کہ کون کدھر ہے اور کیا کرتا ہے؟ کون سی چیز مذہب سے وابستہ ہے اور کون سی رسم ورواج سے۔ وہ الو کی سی دانائی اور بلی کی چوکس نظروں سے سارے گھر کو دیکھا کرتی، خاص کر اسے اماں سے ہمیشہ خدشہ رہتا کہ وہ کہیں پونے پوتیوں کو خراب نہ کر دے۔ اپنی خاندانی روایات سے علیحدہ کوئی نئی پنیری نہ لگا دے۔

دادی اپنی چارپائی ہمیشہ گیلری میں بچھاتی اور رات بھی وہیں کاٹتی۔ اسے خوب پتہ

تھا کون رات کو کس وقت گھر آتا ہے، لڑکیاں کب سوتی ہیں اور بہو کا دروازہ کس وقت بند ہوتا ہے؟ دن کے وقت وہ چارپائی اٹھا دیتی، پھر گیلری میں چوکی پر بسیرا کرتی۔ اس چوکی پر جائے نماز بچھا رہتا جس کا ایک کونہ تہہ کر کے دادی ابلیس کو جائے نماز پر نماز پڑھنے سے روکتی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ میں دادی کی چوکی پر بیٹھا ان سے شیخ سعدی کے نوشیران بادشاہ کی کہانی سن رہا تھا۔ ظفر بے سمجھ تھا۔ وہ گیٹ کے پاس کھیل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی سی چھڑی تھی۔ وہ اچکتا پھر چھڑی زور سے زمین پر مارتا۔ رکتا اور کہتا ..... ''اب آیا مزہ..... آیا مزہ..... بھر دیگی مجھے اڑنگی۔''

پھر دو چار قدم جلدی جلدی اچکتا ہوا میں زقند لگاتا اور پورے زور سے زمین پر چھڑی مار کر وہی جملہ دوہراتا..... ''اب آیا مزہ.....''

دادی نے کہانی درمیان میں چھوڑ دی اور ظفر کی راہ دیکھنے لگی۔ ظفر چھڑی سمیت گیلری کی طرف لپکا۔ اسے گیٹ سے گیلری تک آتے کچھ دیر لگی، لیکن دادی منتظر رہی۔

''ظفر ادھر آؤ.....''

ظفر بادل نخواستہ چلا آیا۔

''ماں کا اثر ہو گیا ہے نالائق نہ دادی کو سلام نہ بھائی کو.....''

''السلام علیکم.....'' منہ تھتھا کر ظفر بولا۔

''ادھر بیٹھو.....''

ظفر میں ابھی اتنی جرات نہ تھی کہ وہ بیٹھنے سے انکار کرتا۔ دادی نے اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا..... ''یہ ہاتھ میں کیا ہے؟''

''چھڑی ہے جی شہتوت کی.....''

''اور تو اس چھڑی سے زمین کو کیوں مار رہا ہے.....''

''ظفر چپ رہا.....

''تو نے دھرتی کو کیوں پیٹا نالائق.....''

ظفر نے کسمسا کر کہا..... ''بس ایسے ہی جی''

''سن رہا ہے ہمایوں..... ایسے ہی ہوا میں بڑک بڑک کر زمین کو پیٹتا ہے کوئی جب تک بات نہ ہو.....''

''ابھی اس نے مجھے گرایا تھا..... دادی جی''۔

''اس نے کیسے گرایا تجھے۔ اچھل کر آ گئی تیرے سامنے بول بتا؟ ہاتھ پاؤں ہیں اس دھرتی کے کہ ٹھوکریں لگاتی پھرے تجھے.....''

''اونچ نیچ تھی جی مجھے نظر نہ آئی..... یہ دیکھئے میری کہنی چھل گئی ہے ساری ظفر بولا''۔

''یہ کہہ ناں..... یہ بتا کہ چہرے پر آنکھیں ہونے کے باوجود تو اندھوں کی طرح چلتا ہے اور پیٹ رہا ہے زمین کو..... ساری عمر کیا ایسے ہی بے انصاف رہنے کا ارادہ ہے..... قصور اپنا ہوگا اور سزا دوسروں کو دے گا؟..... لگا اس کے دو تھپڑ ہمایوں..... لگا ..... لگا''۔

میں نے دادی کو جھپی ڈال کر کہا ''چلئے معاف کر دیجئے دادی.....'' مجھے ظفر کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ نظر آئی۔

''معاف کر دیجئے!..... کتنا معاف کروں تم سب کو..... تمہارا دادا زندہ ہوتا تو ساروں کو سدھ کر دیتا..... وہ رفعت کی بچی مدھو بالا بنی پھرتی ہے..... الو کے پٹھے شاہد کو نہ پڑھائی کا فکر نہ روزی کمانے کا، شاعر بن رہا ہے کم بخت..... اور یہ شیطان کی ٹوئی اور سنو بچو اسی زمین میں دھنسنا ہے آخر کو..... اس پر تو پاؤں بھی پولا پولا دھرنا چاہئے۔ جو یہ پھل فروٹ کھاتے پھرتے ہو ناں..... یہ اسی دھرتی ماں نے بھیجے ہیں۔ پرتم کو پروا..... ماں سارا دن انارکلی میں گھسی پھرتی ہے، دیکھتی پھرتی ہے نت نئی چیزیں

..... باپ کو سیکرٹریٹ ہو گیا ..... تربیت کون کرے؟ نیک و بد کون سمجھائے ان بلونگڑوں کو.....؟ کون بتائے انسان کیوں آیا ہے یہاں، کیا ذمہ داری ہے اس کی''۔

دادی دیر تک بولتی رہی۔ میں اور ظفر گردن جھکائے پاس بیٹھے رہے۔ اٹھ جانے کی ہمت ابھی ہم میں نہیں تھی۔ دادی نے ظفر کا بازو کھینچ کر پوچھا ..... ''دکھا چوٹ کہاں لگی.....''

ظفر نے چھلی ہوئی کہنی اور بازو پیش کر دیا جس سے اب ہولے ہولے لہو رسنے لگا تھا۔

''ہائے ہائے میرے لعل کو تو بڑی چوٹ آ گئی۔ جا ہمایوں روئی لے کر آ.....''

''ٹھیک ہے دادی..... آپی ٹھیک ہو جائے گا'' ظفر منمنایا۔

''ماروں'' گی چپکا بیٹھا رہ''۔

دادی نے زخم پر بوسہ دیا تو اس کے ہونٹوں پر تھوڑا سا لہو لگ گیا۔ پھر پتہ نہیں کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ..... چوٹ لگ جائے تو روتے نہیں ظفر بیٹا ..... ابھی تو کشمیر میں جہاد کے لئے جانا ہے..... مسلمان کا کیا کام رونے دھونے سے..... ہم تو جہاد والے ہیں۔ ظلم کے خلاف، نفس کے خلاف ..... اللہ رسول ﷺ کے سپاہی ہیں ہم لوگ۔ ہمارا رونے سے کیا کام؟ آنسو بہانے والے کسی کا سہارا نہیں بن سکتے۔ نہ اپنا نہ کسی اور کا..... مرد ہو کر رویا نہ کر بیٹے''۔

''لیکن آپ بھی تو رو رہی ہیں دادی.....''

''میں اب روتی ہوں بچڑا، کمزور پڑ گئی ہوں اندر باہر..... اب مجھ سے لہو برداشت نہیں ہوتا..... پہلے ایسے نہیں تھا..... بڑا بڑا لہو بہتا دیکھا ہے میں نے قافلوں میں..... جا کر کر روئی لا ہمایوں کیا آلسی بچے ہیں کہا مانتے ہی نہیں۔ بالکل اپنی ماں پر گئے ہیں'' دادی نے آنسو دوپٹے میں جذب کر لئے۔

دادی کے پاس قدروں کی وراثت تھی۔ وہ اقدار، رسم و رواج، مسلک روزمرہ کی

کامن سنس کا خزانہ تھی۔ وہ اپنی وراثت تیسری پود کو منتقل کرنے کی خواہاں بھی تھی۔ مشرق میں یہ رواج عام رہا کہ ماں باپ بچوں کی پرورش میں مشغول نہیں رہتے تھے۔ ماں کو گھر باورچی خانہ، کپڑا لتا، صفائی ستھرائی مشغول رکھتی، باپ کفالت کی نذر ہو جاتا، لیکن گھر کے بزرگ بچوں پر کڑی نظر رکھتے۔ وہی روایت کو بچوں تک پہنچانے کے ضامن بھی تھے اور بسا اوقات جہالت بھی ان ہی کے وساطت سے پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں تک پہنچتی تھی، لیکن ان کا رعب دبدبہ احسان اس قدر تھا کہ کوئی ان کے آگے بول نہ سکتا تھا..... یہ عجیب قسم کا چکر تھا۔ پہلے بیس سال مشرقی بچہ تعصب کو اپنے بزرگوں سے اخذ کرتا رہتا۔ یہ تعصب عموماً رسم و رواج سے مستعار لئے جاتے۔ پھر اگلے بیس سال ان تعصّبات کو تجربات کی روشنی میں دیکھ، چکھ، پرکھ کر چھان پھٹک کر اپنے سے علیحدہ کرنے میں بسر ہوتے۔ ان سے اگلے بیس سال نئے تعصّبات تیسری پود میں منتقل کرنے کا عہد ہوتا۔ ان تعصّبات کے ہمراہ بیشتر وقت وہ اقدار جو رسم و رواج پر مبنی نہ ہوتیں، بلکہ جن کی اثاث مذہب ہوتا، ان پر عملدرآمد ہوتا یا نہ ہوتا ان پر اتنا کڑا ایمان بھی نہ ہوتا، لیکن دادے کی یہ وراثت بھی آسانی سے اگلی نسل تک پہنچ جاتی۔ دادا خود ریڈ لائیٹ کا رسیا، شراب کا عاشق جوئے کا دلدادہ ہوتا، لیکن اپنے پوتے کو ان برائیوں سے روکنے کا خود کو نہ صرف مجاز ہی سمجھتا، بلکہ اصرار بھی کئے جاتا کہ من کنم شما حذر کنید۔ یہی تربیتی ادارہ اس قدر مضبوط تھا کہ کچھ نہ کچھ چھت سے رسنے والا پانی بنیادوں میں ایمان صورت بیٹھ ہی جاتا تھا۔

بیلکونی میں بیٹھ کر دیر تک میں دادی کو یاد کرتا رہا۔ دادی کی یاد کو بھی میں کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتا۔

میری عادت ہے میں نہ تو اپنی خوشی میں کسی کو شامل کر سکتا ہوں، نہ ہی کسی دوسرے کی رسائی میرے غم تک ہو سکتی ہے۔ اندرون صحن دل میں کسی کو تاکنے جھانکنے کی اجازت نہیں دیتا..... اس تنہائی پسندی، پوشیدگی کا میں عاشق ہوں۔ میں لیمن

ڈراپ کی طرح اندر ہی اندر خوشی کو چوستا رہتا ہوں اور غم کی چیونگ گم کو چباتے رہنا بھی میرا محبوب مشغلہ ہے۔ دادی جب تک زندہ رہی، گیلری میں اس وجود بے معنی تھا۔ جس روز اس کی چارپائی گیلری سے اٹھادی گئی اور وہ میز بھی غائب ہو گیا جس پر ان گنت معجون، چورن، دوائیاں پڑی رہتی تھیں، اسی دن سے دادی سارے گھر میں سرایت کر گئی۔ اماں نے سب سے زیادہ دادی کو ہتھیا لیا اور آہستہ آہستہ ان ہی کا روپ دھارتی گئی، جس دادی سے ماں نے ساری عمر نفرت کی، اسی دادی کی وہ کاربن کاپی بن گئی حتیٰ کہ ان کی شکلوں میں بھی مشابہت پیدا ہو گئی ایسے کیوں ہوتا ہے۔ جس سے نفرت شدید ہو، انسان وہی کچھ بن جاتا ہے۔ دراصل انسان کا کچھ ٹھیک نہیں۔ دماغ تحقیق کی طرف لے جاتا ہے اور قلب وجدان کی طرف اور ایک تیسری سمت ایسی بھی ہے جس کا نہ تحقیق سے تعلق ہے نہ وجدان سے۔

لال بجھکڑ کی کہانی یونیورسل ہے..... مجھے ایک مرتبہ گرمز فیری ٹیل میں بھی اسے پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ کہانی کچھ اس طور پر تھی۔

کسی گاؤں میں ایک سادہ لوح کسان رہتا تھا۔ اس کی غریبی کا یہ عالم تھا کہ بارہا فاقوں پر گزر بسر ہوتی۔ تھک ہار کر اس نے اپنے درخت کاٹنا شروع کر دیئے۔ انکی لکڑی اپنے ریڑھے پر لاد لیتا اور شہر میں صدائیں لگاتا۔ ایک گلی میں ڈاکٹر ''سب جانوں'' کا کلینک تھا پیسے کی ریلی پیل تھی۔ مریضوں کا تانتا بندھا رہتا۔ ایک روز کسان بینڈے کا ادھر سے گزر ہوا۔ آواز لگائی..... ''لکڑی لے لو جی گیلی بھی جلے، سوکھی تو جلے ہی جلے.....'' ڈاکٹر کا اصلی نام تو شاید کسی کو معلوم نہ تھا۔ سبھی اسے جانوں پکارتے تھے۔ ڈاکٹر نے صدا سنی تو پکارا..... ''اوئے بینڈے ادھر آ.....'' جوتا اتار کر بینڈا اندر پہنچا۔ اتفاق سے یہ وقت مریضوں کا نہ تھا۔ ڈاکٹر سب جانوں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ باتوں کا شوقین تھا۔ بینڈے کو بھی دسترخوان پر دعوت دی اور گاؤں کے حالات پوچھنے لگا۔ بینڈے کو بھی دسترخوان پر دعوت دی اور گاؤں کے حالات پوچھنے

لگا۔ بینڈے نے بھانت بھانت کے اخوان نعمت سجے دیکھے تو سوچنے لگا کیا میں ڈاکٹر نہیں بن سکتا؟

پیٹ بھر ٹھونسنے کے بعد بینڈے نے ڈاکٹر سب جانوں سے پوچھا..... ''کیا میں ڈاکٹر نہیں بن سکتا.....''

''لو یہ کیا مشکل ہے..... فوراً بن سکتے ہو؟'' سب جانوں بولا۔

''کیسے؟''

''ایسے کرو اپنا ریڑھا ٹٹو بیچ دو۔ اچھے کپڑے سلاؤ میرے جیسے..... پھر ایک بورڈ پر ڈاکٹر لال بجھکو لکھواؤ اور یہ تختی گھر کے سامنے لٹا دو.....''

ابھی بینڈے کو ڈاکٹر بنے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ گاؤں کے زمین دار کے گھر چوری ہوگئی۔ کسی نے رائے دی کہ آپ ڈاکٹر لال بجھکو سے مشورہ کرلیں۔ وہ بلا کا سیانا ہے۔ فیڈول لارڈ بگھی میں سوار بینڈے پاس پہنچا اور سوال کیا..... ''کیوں بھئی کیا تم ہی ڈاکٹر لال بجھکو ہو.....''

''بالکل'' ڈاکٹر بولا۔

''تو میرے ساتھ چلو اور مخبری کرو کہ اصلی چور کون ہے.....''

''ضرور چلوں گا، لیکن میری بیوی بھی ساتھ چلے گی۔ میں رحموں کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔''

اب یہ تینوں حویلی میں پہنچے۔ اتفاق سے اس وقت دسترخوان بچھا تھا، خدمت گار مامور تھے۔ زمین دار بولا..... ''کھانا لاؤ دیکھتے نہیں مہمان آئے ہیں''۔

جب پہلا خدمت گار بھنے ہوئے بٹیرے لے کر آیا تو ڈاکٹر لال بجھکو نے اپنی بیوی سے کہا..... ''یہ پہلا ہے.....''

ملازم خوفزدہ ہوگیا، کیونکہ ہی پہلا چور تھا۔ اب نے اس اندر جانے سے گریز کیا اور دوسرے نوکر کو تکے کباب پکڑا کر اندر روانہ کیا۔

''لو یہ دوسرا ہوا.....'' ڈاکٹر نے رحموں سے کہا۔

جب تیسرا تندوری روٹیاں لے کر وارد ہوا تو ڈاکٹر نیر ازداری سے کہا.....

''یہ تیرا ہوا.....'' سردار صاحب کو شبہ ہوا کہ ڈاکٹر بجھکو سب جانتا ہے۔

خدمت گار نے اشارے سے ڈاکٹر کو باہر بلایا اور تینوں ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑے ہو کر بولے..... ''سرکار اب تو آپ جان ہی گئے ہیں کہ ہم تینوں نے مال چرایا ہے۔ بس کچھ ایسا کریں کہ ہماری جان بخشی ہو جائے..... ہم آپ کو خوش کر دیں گے''۔

ڈاکٹر نے کہا..... ''اگر بتا دو کہ مال کہاں ہے تو میں کچھ مدد کر سکتا ہوں۔ انہوں نے وہ تندور دکھایا جس میں سونے کی اشرفیاں چھپا رکھی تھیں۔ واپس آ کر ڈاکٹر لال بجھکو نے اپنا قاعدہ کھولا جسے وہ ابھی پڑھنا سیکھ رہا تھا۔ اسے کھول کر پڑھنے لگا..... ''اب باہر آ جا..... کچھ نہ سوچ باہر آ جا.....''

چوتھا چور پردے کے پیچھے تھا۔ ہاتھ باندھ کر ڈاکٹر کے قدموں میں گر گیا..... ''آقا آپ انتریامی ہیں۔ سب جانتے ہیں۔ ہمیں معافی دلوایں دیں.....''

ڈاکٹر نے اس شرط پر مال واپس کیا کہ خدمت گاروں کو کچھ نہ کہا جائے گا۔ سنا ہے جب زمین دار کو تندور سے اپنی دولت مل گئی تو اس نے خوش ہو کر ڈاکٹر بجھکو کو مالا مال کر دیا۔ ادھر خدمت گاروں نے بھی حسب وعدہ بینڈے کی خدمت کی اور اس طرح جناب بینڈا صاحب گاؤں کے امیر ترین وی آئی پی بن گئے.....

اصغری کے ساتھ میں نے لال بجھکو جیسی زندگی بسر کی۔ اس کے ساتھ میری ہر الٹی سیدھی پڑتی رہی۔ وہ مجھے ہر معاملے میں درست ہی سمجھتی تھی۔ میری بیوی اصغری اچھی عورت تھی، اچھائی عورت کا سب سے بڑا وصف ہوا کرتا تھا۔ اس کی عادتیں، سوچ، رہنا سہنا، مذہب سے وابستگی سب مڈل کلاس ہوا کرتی تھیں۔ اس نے کبھی چاچا صمد کی طرح کسی کو شاک کرنے کے متعلق نہ سوچا تھا۔ شادی ہی ایک ایسا خواب تھا، جو اسے

گڑیاں کھیلتے ہوئے ملا اور یہی ایک خواب تھا، جس نے اس کی سائیکی پر کوئی بوجھ نہ ڈالا۔ آپ اسے زندگی سے تہی ایک ہی پگڈنڈی کا بدرنگ مسافر کہہ سکتے ہیں۔ میں اسے ایک آرام دہ ساتھی سمجھتا تھا۔ مجھے خود علم نہیں ہوسکا کہ محبت نہ ہوسکنے کے باوجود ہم دونوں کتنی سہولت سے ساتھ زندگی گزارتے رہے۔ اس نے اپنی فکروں کا بوجھ مجھ پر کبھی نہ ڈالا۔ میں کیا سوچتا رہتا تھا۔ اس کا بار میں نے اس کے جھکے جھکے کندھوں پر نہیں رکھا۔ اصغری میری چچا زاد بہن تھی، پھر وہ میری بیوی بنگئی ..... آخر کو وہ میرے دونوں بچوں کی صرف ماں رہ گئی۔ ہم میں عام میاں بیوی جیسے جھگڑے، چخ چخ نہیں تھی۔ نہ ہی ہم حاسد عاشقوں کی طرح رقیبوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ اسے شاید اقبال والے قصے کا علم تھا، لیکن اس نے مجھ سے کبھی اس معاشقے کی تفصیلات نہ پوچھیں۔ میں جانتا تھا کہ مجھ سے پہلے اس کی منگنی شجاع بھائی سے ہوئی تھی اور یہ منگنی پورے چار سال رہ کر سسکتی سسکتی ٹوٹی تھی۔

میں دل میں اپنے ماموں زاد شجاع بھائی کو پسند کرتا تھا اور جب یہ منگنی ہوئی تھی تو میرا خیال تھا کہ اس خوبصورت گریک دیوتا کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ حسین و جمیل ایکٹر نما شجاع بھائی کے لئے اصغری جیسی لڑکی ناکافی، ناموزوں اور ماں باپ کی نالائقی کا ثبوت تھا ..... بہرکیف شجاع بھائی ہمارے گھر آتے رہے، میں نے کبھی اصغری کو ان میں دلچسپی لیتے نہ دیکھا۔ یہ بھی طرفہ تماشہ ہے کہ شجاع بھائی کو دیکھ کر نہ مجھ میں حسد جاگا، نہ ہی اصغری کے لئے کسی قسم کے شک نے میرے دل میں جگہ پائی۔ اصغری اتنی اہم نہیں تھی کہ میں اس کے ماضی سے بھی حسد کرتا رہتا۔ اصغری سائبان سی عورت تھی۔ ہر وقت سایہ کرنے، دینے، ہونے کے مرحلوں میں رہتی۔ گھر پہنچ کر میں بھی بچوں کی طرح آزاد ہو جاتا، آرام دہ بیوی مجھے اسیری کا محتاج بنا دیتی، میں اسی محتاجی کا عادی ہو گیا جو اچھی عورت پیدا کر دیا کرتی ہے۔ جب کبھی لمبی پارٹنر شپ چلانی ہو تو خود انحصاری کام نہیں آتی، بلکہ آپ کا انحصار ساتھی پر ہوا کرتا ہے۔ وہی

ایسے رشتے کو آگے چلاتا ہے۔ جب بھی آپ کسی شخص پر مالی، جذباتی، ذہنی رفاقت جیسی چیزوں کے لئے دست نگر ہوتے ہیں ایک اچھے رابطے میں ضرور بھر پختگی آجاتی ہے۔ مغرب میں خود انحصاری کے حصول نیآزادی کی طلب نے شادی جیسے مضبوط نظام کو درہم برہم کر دیا ہے۔ اب جنس، روزی، تفریح، رفاقت ذاتی مسئلہ ہے۔ کسی ایک کنوئیں سیپانی پینے کا عمل نہیں اور اتنی خود مختاری حاصل ہونے کے بعد کسی ایک شخص سے بندھے رہنا دست نگر ہونا بہت بڑا وبال بن جاتا ہے..... اصغری اور مجھ میں کئی ضرورتیں سانجھی تھیں۔ میں بری طرح اس سایہ دار درخت کی چھاؤں کا عادی تھا۔ وہ اور اس کے بچے میری کفالت کے بغیر بہت ساری مشکلوں کا شکار ہو جاتے ہیں ..... اسی لئے زیادہ اڑچنوں کے بغیر ہماری پارٹنر شپ نبھ گئی ہم ایک دوسرے کی ضرورت بنے رہے۔

ایک رات اس نیعشاء کی نماز پڑھی۔ دو تین مرتبہ غسل خانے آئی گئی پھر گویا وہ اپنے کوچ کے متعلق یقین کی حد کو پہنچ گئی۔ میں حیران رہ گیا۔

''کیا کہہ رہی ہو..... طبیعت بہت خراب ہے تو ہسپتال چلتے ہیں''۔

''نہیں اس کا وقت نہیں ہے۔ آپ اگر پڑھنا چاہیں تو سورہ یٰسین پڑھیں بیٹھ کر .....''

میں نے ہسپتال جانے کی تیاری شروع کر دی۔

''وقت نہیں ہے جی۔ آپ مہربانی کر کے سورہ یٰسین پڑھیں.....''

اس کے بعد اس نے جہانگیر کی پرورش کے متعلق وصیت کی، ارجمند کے متعلق شاید اسے یقین تھا کہ اس کی تربیت وہ کر چکی ہے اور اب باپ اس کے کام نہیں آسکتا۔

میں نے اصغری کا سوگ کم اور اپنی آرام دہ روٹین کے ٹوٹ جانے کا غم زیادہ کیا۔ مجھ پر جلد ہی یہ بات کھلی کہ اصغری زندگی تھی، اس کا بہاؤ مسلسل تھا اور اقبال تازہ موسموں کی مانند تھی کہ بدلتے رہے، آتے جاتے رہے، لیکن کبھی بھولے نہیں..... ان

کے سحر سے میں کبھی آزاد نہ ہو سکا...... میں نے اپنی سوچ پر اصغری کا کوئی بوجھ نہیں ڈالا۔ وہ اللہ کی نعمتوں میں سے تھی جیسے میں نے اللہ کی اور کسی نعمت کا بھی شکریہ ادا نہیں کیا، ایسے ہی اصغری کا شکریہ ادا کیئے بغیر اسے بھی دفنا دیا۔ اس بیلکونی میں پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ کر سامنے گریک بڈھے کو سگریٹ پیتے دیکھتا ہوا سوچتا ہوں۔ میں اس دنیا میں کسی کام کے لئے آیا تھا؟ کیا میں اپنی معنویت سے بے خبر ہی چلا جاؤں گا؟

کیا میں ناکردہ حسرتوں اور گناہوں پر آنسو بہانے کے لئے اتنے سال یہاں رکا رہا؟ کیا واقعی بابا آدم کے اولین گناہ کی پاداش میں میری زندگی پرائسچت میں گزرنی چاہئے؟ کیا کہیں...... اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود میں ادھورا ہوں اور اقبال کی تلاش اصل میں اسی ادھورے پن کو مکمل کرنے کی کوشش ہے...... حقیقت کے ہوئے خیال کی تلاش؟

کیا انسان اس ادھورے پن کے احساس سے کیوں اور کیسے میں بدل جاتا ہے؟

کیا یہ ادھورا پن بیرونی ہے یا اندر سے انسان خالی محسوس کرتا ہے، تڑپتا ہے، مضطرب ہوتا ہے، پھر بھی مکمل نہیں ہو پاتا۔ جس طرح چھپکلی کی دم کٹ کر تڑپتی رہتی ہے اور اسے معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بے قراری کیوں ہے؟

کیا خوشی کی تلاش سراب کا سفر تو نہیں؟ اصلی خوشی انسان کے لئے عنقا ہی نہ ہو؟ سوچتا ہوں جب تک انسان غریب ہوتا ہے، اسے جسمانی دکھ چمٹے رہتے ہیں۔ ناداری کا حملہ جسم پر ہوتا ہے، لیکن جونہی وہ دولت مند ہو کر عام ماحولیاتی سہولتیں حاصل کر لیتا ہے، جسم آسودگی کے ایسے لیول پر آجاتا ہے جہاں اسے اس کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کسی قسم کی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ ایسے میں جب جسم کی تمام ضرورتیں پور ہو چکتی ہیں، روح انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہے اور اپنے مطالبات پیش کر دیتی ہے، اب غیر مرئی ضرورتیں، نظریات، ذہنی نفسیاتی اڑچنیں، سوال در سوال،

خیال در خیال، سوچ کا سلسلہ دراز ہو جاتا ہے، یہ وہ وقت ہوا کرتا ہے جب جسم اور اس کی ضروریات عموماً شانت ہوا کرتی ہیں، لیکن روح کی بیزاریاں بڑھنے لگتی ایسے میں اصلی مشکلیں کم اور خیالی مسائل زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اب ٹینشن، فرسٹریشن، Anxiety کا دور شروع ہوتا ہے۔ انسان کی روح، نفسیات، ذہن بے تاب رہنے لگتا ہے۔ اب پراگندگی کا حملہ باہر سے نہیں ہوتا، اندر سیٹھم نصیب انسان آرام دہ زندگی بسر کرتا ہوا مثل آنسو سدا گرنے پر آمادہ رہتا ہے۔

جب قیام پاکستان کے بعد ہم لاہور پہنچے تو ہمارے جیتے جاگتے مسائل تھے۔ روٹی پانی رہائش کا جھگڑا تھا۔ بچوں کی تعلیم، شادی، روزمرہ کے اخراجات ہر کمرے میں مسئلے ڈگڈگی بجاتے پھرتے تھے..... لیکن اماں، ابا، دادی، دادا اندر سے شانت تھے۔ ان کے بھیتر ٹھنڈے فوارے چلتے تھے..... وہ خوش تھے کہ انہوں نے پاکستان پالیا۔

پھر آہستہ آہستہ وہ مسائل ختم ہوتے چلے گئے..... لکشمی دیوی نے میں اپنا پجاری بنالیا..... اس کی سینا نے باہر کے تمام محاصرہ داروں کو مار بھگایا، لیکن پھر اندر کہیں سے ٹروجن ہارس آموجود ہوا۔ اس میں سے ایک اور طرح کی فوج نے سر نکالا اور ہم سب کو آہوں، سسکیوں، یادوں اور نا کردہ حسرتوں کے حوالے کر دیا..... اب ہم ناداری کے ہاتھوں نہیں پڑ رہے تھے، بلکہ سب کچھ پا چکنے کے بعد کھو لے پن کا شکار تھے۔ ہولے ہولے منفی جذبوں کی گرفت میں آکر ہم غم آشنا ہو گئے۔ حسد، نفرت، حرص، نمائش، مقابلہ، ان گنت مشکلات کا اندر ہی سے سامنا تھا۔ قعر دریا میں طوفان موجزن تھا۔ روئے دریا بالکل ساکن تھا۔ میں نے بھی ذاتی اذیت کے لئے اقبال کے خواب کو بڑے رنگ دیئے تھے۔ اسی خود ساختہ مسئلے نے مجھے خوب نچوڑا تھا، حالانکہ حقیقت میں مسئلہ موجود تک نہ تھا۔

سوچتا رہتا ہوں کہ اس دارالمحن سے نکل کر ہمیں کہاں جانا ہے اور غم کی کون سی نئی شکل سے نبرد آزما ہونا ہے؟ کیا خوشی کے لئے سرگرداں رہنا ہی بنی نوع انسان کی اصل

جدوجہد ہے؟

بیچارہ دنیا میں قدم دھرتا ہے تو روتا ہے، جب وہ رخصت چاہتا ہے تو لوگ روتے ہیں ان دو وقفوں کے درمیان اسی رونے سے گریزاں وہ عرصہ حیات کو لغو اور بے معنی خوشی کی تلاش میں گزار دیتا ہے۔ کیا غم سے لڑنے بھڑنے، نبرد آزمائی کرنے یا غم سے خوشی اور خوشی سے غم کی جانب شٹل کاک کی طرح مارے جانے کا نام زندگی ہے؟ کبھی غم اس قدر دید ہوتا ہے کہ انسان لرزے کے بخار میں جکڑا جاتا ہے۔ کبھی حزن و ملال شدید نہیں ہوتا، بلکہ نناوے ڈگری کی حرارت بن کر انسان اس میں پھنکتا رہتا ہے۔ اسے لگتا ہے زندگی کا علاج سوائے مرگ ناگہانی کے اور کچھ نہیں۔ غم آنسو میں ڈوبا ہو کہ سسکی صورت لبوں پر رہے، کپڑے پھاڑ کر نکل جانے کو جی چاہے یا جائے نماز پر سجدے سے اٹھتے نہ بنے۔ غم کو بہر صورت جس زاویئے، رخ، سمت سے دیکھو، انسان کی مجبوری کا نام ہے۔ حقیقی غریبی اسے جنم دے یا تمول کید باؤ سے لرزہ پیدا ہو۔ انسان غم کی گرفت سے کبھی نہیں نکلتا..... خوشی محض تکان اتارنے کا وقفہ ہے اور ماندگی کے اس وقفے سے تازہ دم ہو کر انسان پھر غم کی تلاش میں بگولا بن کر کہیں گرتا کہیں گھومتا کہیں سرپٹ بھاگتا زندگی گزارتا رہتا ہے۔

آج کے انسان نے دفاع غم کے لئے ان گنت خوشیاں بنالی ہیں۔ جس طرح وہ صحت کے لئے ادویات ایجاد کرتا چلا جاتا ہے، ایسے ہی وہ غم سے نپٹنے کے لئے میڈیا، بازار، ہوٹل، سفر کو استعمال کر رہا ہے۔ خوشیوں کا بازار پھیلا ہے، وہ ان میں اپنے مطلب کی خوشی تلاش کرتا رہتا ہے، لیکن پھر بھی خوشی دیرپا نہیں ہوتی..... اسے بھی رنگ برنگی ایلوپیتھک گولیوں کی طرح بار بار استعمال کرنا پڑتا ہے۔ آنسوؤں کا رنگ کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ حادثہ، واقعہ، حالات بدل جائیں، لیکن اندر عموماً برسات یک رنگ ہوتی ہے۔ غریبی کے دکھ، محرومی اور عزت نفس کی کمی کے باعث بے دم کرتے ہیں۔ امیری کے اپنے پرسوز مراحل ہیں۔ ہجر کا غم اور طور کا ہے اور وصل میں موج محیط

آب والا معاملہ پیش آتا ہے۔ کچھ خواب پریشان بن کر اقبال کی طرح ستاتے ہیں۔ کچھ اصغری کی طرح جالے بن کر جا بجا لٹک جاتے ہیں۔ شاید مشیت چاہتی ہے کہ انسان چوٹی سے گرے اور کونے دار پتھر کی طرح رگڑ کھاتا ہوا نیچے پہنچے، لڑھکتا جائے۔ اس کے سارے کونے چوٹیاں گھس جائیں اور وہ ایک خوبصورت، چمکدار مدور پتھر میں بدل جائے جو ساحلوں پر چمکتی دھوپ میں پرسکون ابدی لہروں کا گیت سنا کرتے ہیں۔

زندگی تو دروپدی کی ساڑھی ہے۔

دروپدی پانچ پانڈوراجاؤں کی واحد پتنی تھی۔ یدھشٹر، ارجن بھیم سین نکل سہدیو کی پیاری راج دلاری..... جب مہاراج ادھیراج یدھشٹر نے جوئے میں دوشاشن کے ساتھ بازی لگائی اور دروپدی کو ہار دیا، تو سارا دربار چپ ہو گیا کہ جانے اب کیا ماجرا ہو۔ دیکھئے دوشاشن کی جیت کیا رنگ لائے؟ دوشاشن سنگھاسن سے اترا۔ دروپدی مارے شرم کے سر جھکائے بازوؤں کے ساتھ سینہ ڈھانپے تصویر ندامت بیچ دربار کھڑی تھی۔ دوشاشن میں سو ہاتھیوں کا کس بل تھا۔ تکبر سے اینٹھ کر آگے بڑھا اور چاہا کر سر دربار دروپدی کی ساڑھی اتار دے.....

اب تو دروپدی چلائی..... ''کہاں ہو یدھشٹر، ارجن، بھیم، نکل سہدیو۔ میں لاج کی ماری پکارتی ہوں۔ تم سن کر جواب نہیں دیتے؟''

ادھر دوشاشن نیپلو کھینچا تو دروپدی چیخی..... ''اے بھگوان میں ان دشٹ لوگوں کی اتیاچاری سے پریشان نہیں۔ دکھ تو اس بات پر ہے کہ میرے تو پانچ پتی ایسے ہیں کہ جن سے موت بھی بھاگتی ہے۔ وہ میری لاج جاتے دیکھ رہے ہیں اور چپ، ہیں..... بھیشم پتامہ سمیت سارے بزرگ راجہ دھرتراشٹ جیسے سسر نے بھی مون سادھ لی .....اب مہاراج کرشن مرلی دھر آپ ہی لاج بچائیے.....''

سنتے ہیں اسی وقت دروپدی کے تن سے رنگ برنگی ساڑھی کا کپڑا نکلتا چلا آیا۔ لال،

نیلا، پیلا..... سرکا سنی..... سارا دربار ساڑھی کے کپڑے سے بھر گیا۔ دوشاشن کے ہاتھ شکل ہو گئے، لیکن مہاراج کرشن نے دروپدی کی بنتی سن لی..... اور اسے بے حیائی کے حوالے نہ کیا..... ایسے ہی سچے پکارنے والے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹے۔ ابدی سکون کو چاہنے والے یہاں وہاں ہر، مقام پر اسے حاصل کر ہی لیتے ہیں۔ انہیں زندگی میں ہی نروان، سکون، فلاح حاصل ہو جاتی ہے، لیکن دنیا میں ایسے لوگ کم ہی ہوا کرتے ہیں۔

ہم دونوں ناشتہ کرنے ڈائینگ ٹیبل پر بیٹھے ہیں۔ ابھی ابھی ڈش واشر بند ہوا ہے اور یکدم کمرے میں خاموشی چھا گئی ہے۔ سامنیوالے بلاک میں پھر سے آگ کے خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ شاید باورچی خانے میں پراٹھے پک رہے ہوں یا کوئی ہانڈی جل گئی ہو۔ کبھی کبھی خطرے کی گھنٹی اسی طرح لوگوں کو محتاط کرتی رہتی ہے۔ اس لئے بھی لوگ گھر سے باہر ہی سگریٹ نوشی کرتے ہیں، کیونکہ زیادہ تر گھر لکڑی سے بنے ہیں۔

ارجمند نے سیاہ جینز اور نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی ہے۔ جب بھی گردن موڑتی یا کچھ اٹھاتی ہے اس کی پونی ٹیل ہلتی رہتی ہے۔ اس کے سامنے بغیر دودھ والی Expresso کافی کی پیالی اور بیگل ہے۔ امریکن عام طور پر اس سخت بند کا ناشتہ پسند کرتے ہیں یہ لوگ دن میں کئی مرتب بیگل اور Cereals کھاتے ہیں۔ ان دونوں کی تیاری میں وقت نہیں لگتا۔ بچے بھی کارن فلیکس ہنی فلیکس اور قسم قسم کے Cereals کو چباتے پھرتیہیں۔ فاسٹ فوڈز پر امریکی زندہ رہتے ہیں۔ میکڈونلڈ، کے ایف سی، کنگ برگر اور ایسی ہی کئی فوڈ Chains آپ کو جگہ جگہ نظر آئیں گی۔ جو ہر لمحہ ورک اوہولک کو رجھانے اور موٹا بنانے کا کام کرتی ہیں۔ کام کرنے والے کے پاس پکانے کا وقت نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ فاسٹ کھانے ہی کھا سکتا ہے۔

امریکہ بھی ہر ملک کی طرح ہر انسان کی مانند تضادات کا گھر ہے۔ہاں آرام بھی بہت اور کلفتیں بھی ان گنت۔موٹاپا بھی ہاتھی جیسا اور دبلے پن کی خواہش میں بھٹکنے والے بھی ان گنت۔جوکنگ کرنے والے Eating Disorders کے کلینکوں پر جانے والے، سلمنگ پارلرز میں دھکے کھانے والے بھی بے شمار۔ادھر سگریٹ کو سرجن جنرل منع کرنے میں شیر، ادھر سگریٹ انڈسٹری کے اشتہار بے شمار، ہر موڑ پر تضاد.....اندر باہر تادات اور تضاد میں گھرا ہوا لمحہ لمحہ گھلتا گھلاتا انسان۔

''ابو آج میں نے آپ کے لئے شامی کباب بنا کر فریز کر دیئے ہیں بالکل امی کی طرح سبز مرچ اور پیار سے بھر کر''.....امی کا نام لے کر وہ خاموش ہو جاتی ہے۔کچھ ناموں پر موت نے خاموشی کا حجاب ڈال دیا ہے۔سوچتا ہوں ماضی کے لوگ، واقعات، یادیں، ماضی کی پراسرار گلیاں ہیں۔ہم انہیں بھولنا بھی چاہیں۔سرد آہیں، مندی آنکھیں، رکی رندھی آواز، روکے ہوئے آنسوؤں سے بندھ بھی باندھیں، لیکن یہ یادیں ہمیشہ ہمارے تعاقب میں ہو لیتی ہیں۔جیسے اندھیرے میں چور کے پیچھے کوئی پولیسیا چل رہا ہو۔مجھے ایک اور ارجمند ماضی میں مجبور کھڑی نظر آتی ہے۔خود امریکہ کے ہاتھوں فیصلے کرنے والی اور مجھ پر اپنی مجبوری سے دباؤ ڈالنے والی۔

شاید میں کسی کو سمجھا نہیں سکتا کہ باپ کے لئے بیٹی کیا چیز ہے۔وہ اس رشتے میں کس درجہ مجبور ہوتا ہے۔بیٹی کی تمام مشکلات باپ کے لئے کسی محدب شیشہ سے گزر کر اتنی بڑی ہو جاتی ہیں کہ پھر باپ ان سے مقابلہ تو کرتا رہتا ہے، لیکن ہمیشہ بیٹی کے لئے خوفزدہ ہی رہتا ہے۔بیٹی گھر سے وداع کر کے ماں باپ کبھی اس کے وجود سے خالی نہیں ہوتے۔بیٹا ساتھ بھی رہے، ایک گھر میں ایک ہی دروازے سے آتا جاتا رہے، شادی کے بعد ماں باپ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جاتا ہے۔جب ارجمند نے سر جھکا کر کہا تھا.....''آپ کو معلوم نہیں ابا۔میری زندگی امریکہ میں کتنی مشکل ہے۔میرا شوہر مجھے نہیں سمجھتا۔میں پوری کوشش کرتی ہوں، لیکن وہ مجھ میں.....میرے وجود

میں ..... میری ذات میں رتی بھر دلچسپی نہیں رکھتا۔ ہمارے گھروں میں مرد کو گھریلو کاموں میں دلچسپی لینا سکھایا ہی نہیں جاتا ..... وہاں ..... بڑی مشکل ہے ابا جی۔ بلال کو میری مدد کرنی چاہئے، لیکن نہیں کرتا ..... میں کماؤں بھی اور گھر بھی رکھوں ..... بچے بھی پالوں ..... ارجمند کیا کیا کرے ابا جی ..... کیا کچھ کرے؟''

میں آپ کو کسی تسلسل یا تواتر سے کوئی کہانی سنانا نہیں چاہتا ..... بلکہ یہ چھوٹی چھوٹی جھلکیاں ہیں جو وقت بے وقت مجھے ستایا کرتی ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ جہانگیر کے ساتھ میں امریکہ نہیں گیا۔ ہوسکتا ہے اس میں ساری فلاسفی کے باوجود کہیں اندر ہی اندر خوف بھی ہو۔ شاہدہ Feminist تھی۔ وہ عورتوں کی آزادی کی اس حد تک متمنی تھی کہ اس کے دل سے وائے اپنے ہر کس و ناکس کی زندگی، عزت اور خوشی محو ہو چکی تھی۔

میری بیٹی ارجمند بھی آزادیٔ نسواں کی ویسی ہی علمبردار تھی ..... وہ بھی جب مجھے گھر سے اکھاڑنے اور امریکہ میری پیوند لگانے کے درپے ہوئی تو اس کی ساری منطق شاہدہ جیسی تھی۔ وہ اپنے ڈاکٹر شوہر کے خلاف ویسے ہی پٹ سیاپا میں مبتلا تھی جیسا شاہدہ نے اپنے گھر والوں میں جہانگیر کے خلاف کیا ہوگا، لیکن بیٹی کے لئے باپ کا دل مختلف ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ فرد اور قوم جب کچھ مان لیتی ہے تو پھر اس کے ردعمل انصاف پر مبنی نہیں رہتے۔ وہ اپنے نظریے اور عمل کے لئے ایسے ایسے جواز ایجاد کرتی ہے جو سرے سے بے انصافی پر مبنی ہوتے ہیں۔ ارجمند کے معاملے میں میری ہمدردی، محبت اور مدد کی خواہش سرسطح تھی۔ تلچھٹ میں کیا تھا، اس کی مجھے خبر نہ تھی۔

''آپ کو معلوم نہیں ابا جی! ڈاکٹر صاحب کتنے پتھر دل ہیں۔ ان کے پاس تو میرے لئے کوئی وقت ہی نہیں ہوتا۔ ہسپتال سے آکر سیدھا ٹیلی ویژن فٹ بال، فٹ بال، فٹ بال ..... پھر کھانا پینا اور کھٹ بسرا ..... صبح شام وہی روٹین ..... میرا تو وہ